کوریا سے واپسی کا سفر:

لاہور سے نکلتے ہوئے ہمارے لیے واپسی کا جو ہوائی ٹکٹ بنایا گیا تھا اُس کی رُو سے ہمیں براستہ تائیوان منیلا (جزائر فی لیپائنز) جانا تھا۔ لیکن کوریا میں ہمارے سفارت خانے والوں نے ہمیں اس راستے کو بدلنے کا مشورہ دیا اور پریشانی کی وجہ یہ بتائی کہ چند روز پیشتر پاکستان کے سیکرٹری خارجہ اِسی پرواز سے تائیوان ہوتے ہوئے اپنے مُلک گئے تھے تو عوامی جمہوریہ چین کی حکومت نے حکومتِ پاکستان سے باقاعدہ شکایت کر دی۔ چین تائیوان کو جُدا جمہوریہ تسلیم نہیں کرتا اور پاکستان کی بھی یہی پالیسی رہی ہے لہٰذا تائی پی (تائیوان) سے کسی قسم کے مراسم سے کترانا چاہیے۔ لہٰذا ہم نے اپنا راستہ بدل دیا اور یوں ہانگ کانگ ہوتے ہوئے منیلا کے لیے چل پڑے۔ ہانگ کانگ میں ایک رات رہے اور وہاں کے نلکوں کا پانی ایک مرتبہ پھر پیا۔

فلپائن کا صدارتی محل:

اس دفعہ فلپائن کا سفر مقابلتاً زیادہ تفصیلی تھا۔ بُنیادی طور پر تو اس دورے کا مقصد یہاں کی مقامی حکومتوں کے طور طریقوں کے متعلق معلومات حاصل کرنا تھا۔ سو اس سلسلے میں تو ہمیں تفصیلی بریفینگز دی گئیں۔ منیلا۔ کوزون۔ سی بو۔ جزائر منڈاناؤ وغیرہ میں چلنے والی لوکل گورنمنٹس کے دفاتر کو ہم نے جا کر دیکھا۔ اُنکے طریقہ کار سے آگاہی حاصل کی۔ اور پھر اپنے گروپ کی جانب سے ہم نے ہی حاصل کی ہوئی معلومات پر مبنی رپورٹ بنائی اور واپس آ کر لاہور میں پاکستان ایڈمنسٹریٹو یو کالج کے سُپرد کی۔

اس دفعہ ہمیں منیلا میں وہاں کے صدارتی محل کو بھی دیکھنے کا موقع ملا۔ مختلف ادوار میں وہاں کے حُکمرانوں کے زیرِ استعمال رہائشی کمروں میں گھومے پھرے۔ اُن کے طرزِ بود و باش اور پسند و ناپسند کے متعلق معلوم ہوا۔ اُسکی تفصیل یہاں بیان کرنا مقصود نہیں لیکن اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ ان میں ''کئی آباد کار آئے اور کئی خانہ خراب آئے'' ہمارے گائیڈ نے بطورِ خاص ہمیں ایک طویل عرصے تک آمرانہ طرزِ حکومت کے لئے مشہور صدر مارکاس کی بیوی ایمیلڈا مارکاس کا وہ کمرہ بلکہ ہال دکھایا جہاں محترمہ نے اپنے 3,600 جوتوں کے جوڑوں کو نمائش کے لئے سجا کر رکھا تھا۔ مشہور یہ تھا کہ وہ کوئی بھی پیزار دوسری بار استعمال نہیں کرتی تھیں یہ اور بات ہے کہ حکومت سے اُنکے شوہر نامدار کی علیحدگی کے بعد اُنکی امریکی جزیرہ ہوائی میں جلا وطنی کے دوران جب اُنکی توجہ ان قیمتی اور نایاب جوتوں کی تعداد کی طرف دلائی گئی تو دُنیائے فیشن کی بے تاج ملکہ فرمانے لگیں ''بالکل غلط!

ان جوتوں کی اصل تعداد 3,599 جوڑے تھی۔'' ان مُحترمہ سے ہی یہ قول بھی منقول ہے کہ ''اگر آپ کو یہ معلوم ہے کہ آپ کے پاس کتنا کچھ ہے تو غالباً آپ کے پاس بہت کچھ نہیں ہے'' [1]

مشرق کا گوہر نایاب:

ہسپانوی آبادکاروں نے شہر منیلا کو مختلف دلچسپ ناموں سے موسوم کیا۔ وہ اسے ''مشرق کا گوہر نایاب۔ ہماری مُحبتوں کا شہر''، خلیج کے کنارے بستی۔ اور ایک ممتاز اور وفادار شہر کے طور پر یاد کرتے رہے۔ واقعی خلیج منیلا کے کنارے موجود سیر گاہ کا لُطف ہی کچھ ایسا ہے کہ برسوں اُسکی یاد نہیں بھولتی۔ اور پھر غروبِ آفتاب کا منظر تو ہمیشہ یاد رہتا ہے جہاں اس نامور کھاڑی کے کنارے واقع ناریل کے درختوں کے پیچھے آفتاب عالم تاب اپنا چہرہ چھُپاتا ہے تو بے ساختہ ہر دیکھنے والے کے دل میں ایک رومانوی کیفیت جاگزیں ہو جاتی ہے۔

چودہ ملین آبادی کا یہ شہر دریائے پاسگ کے دہانے پر واقع ہے اور فی کلومیٹر پر رہنے والی آبادی کے تناسب سے منیلا دُنیا کا گُنجان ترین شہر مانا جاتا ہے۔ یہاں ایک مربع کلومیٹر میں آباد لوگ 43,000 بتائے جاتے ہیں۔ اس کا مقابلہ دُنیا کے دوسرے گنجان آباد شہروں سے کیجئے۔ پیرس میں یہ تناسب 20,164 ہے تو شنگائی میں 16,364، بیونس ایرز میں 2,178 جبکہ ٹوکیو میں محض 1,000 بتائے جاتے ہیں۔ [2] شہر کو سولہ اضلاع میں تقسیم کیا گیا ہے۔ جو ایک صد زونوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ سب سے بُنیادی اکائی ''بارینگے'' کہلاتی ہے۔ ضلع اور زون کی سطح پر مقامی حکومت کا کوئی نظام نہیں ہے لیکن شہر کے 897 بارینگوں میں ہر ایک کا ایک مُنتخب صدر نشین اور عوامی مُنتخب کونسلر ہوتے ہیں اور یہی یہاں کی عوامی جمہوریت کی ایک شان ہے۔ ہم نے بھی منیلا کے ایک ''بارینگے'' کے دفتر میں جا کر عوامی نمائندوں سے تبادلہ خیال کیا۔ اُنکی نگرانی میں چلنے والے ایک سکول اور ہسپتال کا انتظام جا کر دیکھا۔ اور ایک نامہ بر کے طور پر سکول کے بچوں کے ایک نمائندے کو پاکستانی ڈاک کے ٹکٹوں کا ایک خوبصورت البم دیا۔ بچوں نے اسے ایک نایاب تحفہ سمجھ کر تہہ دل سے ہمارا شُکریہ ادا کیا۔

فلپنی پارکوں اور باغوں کے خاصے رسیا مشہور ہیں۔ ان میں راجہ سلیمان پارک۔ منیلا بورڈ واک۔ باغِ وحُوش اور گلستانِ اشجار و نباتات صرف چند ایک ہیں۔ سب سے اہم پارک البتہ رِزال پارک ہے۔ جو نوآبادیاتی نظام سے آزادی کے بعد فیلپینیوں نے ایک آزادی کے متوالے کے نام سے بنایا۔ ہلال کی

---

[1] بحوالہ ''دی ٹریڈر یویو۔ 16 جنوری 2008ء''

[2] وِکی پیڈیا ڈاٹ کام

شکل کا یہ پارک اپنے اندر جُو سے رِزال کی باقیاتِ خاکی کے علاوہ کئی دیگر دلچسپیاں سموئے ہوئے ہے۔ ان میں قومی عجائب گھر۔قومی لائبریری، تِتلیوں کی تماشا گاہ۔آڈیٹوریم وغیرہ شامل ہیں۔منیلا کے پھلوں اور سبزیوں کی مارکیٹیں تو روایتی طور پر مشہور ہیں لیکن آج کے منیلا کے جدید شاپنگ مالز کو دیکھے بغیر نہیں بنتی ۔جہاں پر رنگ برنگ تتلیوں جیسی خوشنما پوشاک پہنے ہنستے مُسکراتے چہرے اپنے معزز گاہگوں کو اپنی جیبیں جلد از جلد ہلکی کرنے پر تُلے نظر آتے ہیں۔ویسے جزائر فیلپائنز کے باسیوں کے گرمائی لباس کا کیا کہنا اور اس موسم کے بغیر یہاں کوئی اور موسم ہوتا بھی نہیں۔

منیلا کی مشہورِ زمانہ یونی ورسٹیوں کی ایک جھلک دیکھنے کے علاوہ ہم نے اُن کے صاف پانی کی فراہمی کے نظام کا صدر دفتر بھی دیکھا۔اتنی بڑی آبادی کے شہر کو جو چاروں طرف سے نیلگوں پانیوں سے گھرا ہوا ہے صاف پانی فراہم کرنا ایک مشکل کام ہے۔وہاں کے ڈائرکٹر نے ہمیں بتایا کہ وہ عالمی بینک کی جانب سے کچھ عرصہ تک ہمارے شہر کراچی کی آب رسانی کے ادارے سے بھی وابستہ رہے ہیں۔معلوم ہوتا تھا وہ یہاں کی مُشکلات سے گھبرا کر ہتھیار پھینک چکے تھے البتہ وہ شہر لاہور میں آب رسانی کے نظام کو مقابلتاً بہت بہتر بتا رہے تھے۔

دوسرے جزائر:

یوں تو فیلی پائنز سات ہزار کے لگ بھگ جزیروں پر مُشتمل مُلک ہے لیکن منیلا کے نینوئے آکینو ہوائی اڈے سے اُن دنوں چالیس عدد ہوائی کمپنیاں مُلک کے چھبیس دوسرے مقامات تک روزانہ کی بُنیاد پر پروازیں لے جاتی تھیں۔دیگر ممالک کے صرف اُنیس ہوائی اڈوں تک روزانہ کی بُنیاد پر سروس مُہیا کی جاتی رہی۔منیلا شہر کا قیپو ڈسٹرکٹ اچھی خاصی تعداد میں مسلمان آبادی رکھتا ہے جہاں مساجد کے مینار بھی نمایاں نظر آتے ہیں۔ لیکن مرکز سے علیحدگی یا کم از کم مکمل خودمُختاری کی آرزو رکھنے والی مسلمان آبادی کا تناسب منڈاناؤ اور دیگر جزائر میں پایا جاتا ہے۔یہ خواہش اکثر و بیشتر تشدد کا روپ بھی دھار لیتی ہے۔لہٰذا مرکزی حکومت اس قسم کے رُجحانات کی حوصلہ شکنی کرتی ہے لیکن ہماری سفارت کے اہل کار کچھ زیادہ ہی پریشان دکھائی دے رہے تھے۔ خصوصاً تبلیغی جماعت کے اراکین کے جنوبی جزائر میں آمد و رفت کے تناظر میں۔

بہر حال ہمیں منڈاناؤ جانے کا بھی موقع ملا۔وہاں کی مقامی حکومت اور مئیر صاحب پر گرم اور مرطوب موسم کی چھاپ کچھ زیادہ ہی نمایاں نظر آئی۔کہاں ملک کے سب سے بڑے تجارتی اور ثقافتی مرکز کیوزون کی پُر اعتماد حکومت

کے انتہائی تروتازہ اور خوش پوش اراکین اور اہلکار اور کہاں ان جزائر کے مکینوں کی تساہل پسندی۔ فرق واضح تھا اور اس پس منظر میں عوامی اُمیدوں اور شکایات کا سلسلہ۔ سی بو شہر کی اپنی تاریخی حیثیت مُسلم دکھائی دی۔ یہاں ہمیں ہسپانوی نو آبادکاروں کی تعمیر کردہ اولین یورپی طرز کی عمارتیں دیکھنے کو ملیں جن پر سولہویں صدی کے طرزِ معاشرت کی چھاپ بالکل نمایاں تھی۔ وہیں ہم نے وہ جگہ بھی دیکھی جہاں ہسپانوی جنرل اور فاتح میگالان کو قتل کیا گیا تھا اور اُس میدان پر بننے والے کلیسا کو بھی جہاں پر ہسپانوی فاتحین کی معیت میں آنے والے پادریوں نے پہلا مذہبی اجتماع منعقد کیا۔ میگالان کے قاتل جنگجو سردار لاپالاپو کے نام سے موسوم سڑک۔ ریستوران اور جزیرہ بھی دیکھنے کو ملا۔ گویا اب وہ ایک قومی ہیرو کی حیثیت لے چُکا ہے۔ یہیں پر ہم نے ایک انتہائی خوبصورت ساحل اور تفریحی مرکز دیکھا جسے ایک جرمن نژاد سرمایہ کار نے بڑی محنت سے ترقی دے کر واقعی قابلِ دید مقام بنا دیا ہے۔ قدرت نے ان تمام جزائر کو قدرتی حُسن وخوبی سے مالا مال کر دیا ہے اور ان مناظر کی حسین یادیں اسی قابل ہیں کہ اُنہیں یاد رکھا جائے۔

دلّی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب:

تاریخ کے مختلف ادوار میں شہر دِلی کو ہمیشہ سے عروسُ البلاد کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کے جانشینوں کی مُغل سلطنت پر گرفت کمزور پڑتی گئی تو اُن کے آباؤ اجداد کی وسیع و عریض مملکت اتنی سمٹی کہ شاہ عالم ثانی نے جب اقتدار کی باگ سنبھالی تو کسی دل جلے شاعر نے اُنکی سلطنت کا جغرافیہ اس ایک شعر میں سمو دیا

پادشاہی ءِ شاہ عالم۔ از دِلیّ تا پالم۔

اب یہ پالم کیا تھا۔ عروس البلاد دہلی کا ایک مُضافاتی گاؤں جہاں کی قسمت جاگی تو مغلوں سے اقتدارِ دِلی چھیننے والی انگریز سرکار نے وہاں پر شہر کے لئے ہوائی اڈہ تعمیر کر دیا۔ یہیں پر ہمارے بھی چند پھیرے لگے۔ لیکن اس بار کوریا اور فیلپائن جیسے پوربی دیسوں سے بینکاک کے راستے واپسی پر ہم بھارت یاترا پر پہنچے تو دہلی کے ہوائی مُستقر پر ایک مختلف سماں نظر آیا۔ ہمیں اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ سب کچھ بدلا بدلا سا اور انتہائی جدید سہولیات سے آراستہ پیراستہ ہوائی اڈہ اپنا مُنتظر پایا۔ معلوم ہوتا تھا کسی اور ہی سیارے پر ہمارے طیارے نے ہمیں اُتار دیا ہے۔ پتہ چلا آج ہی اسی نئی سہولت کا افتتاح ہوا ہے۔ اتفاق سے بھارت کو بھی ایک نئے نیتا راجیو گاندھی کی صورت میں مل گئے ہیں۔ قسمت اُنہیں اپنے عظیم بزرگوں کی پیروی کرنے کے لیے سیاست میں

کھینچ لائی تھی ورنہ اس سے قبل وہ ایک اچھے پائلٹ کے طور پر پہچانے جاتے تھے ''ظاہر ہے ایک پائلٹ کی پہلی ترجیح اچھی سفری سہولیات اور ایک اچھا ہوائی اڈہ ہوسکتا ہے'' ہمارے ایک دوست نے یاد دلایا۔

شہر دہلی آج کئی حصوں میں بٹا ہوا ہے لیکن آسانی کی خاطر ان اجزاء کو نئی دہلی اور پُرانی دلی میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ صرف یہی نہیں اس کے مُضافات میں فرید آباد اور دیگر کئی علاقے بھارت کی جدید اقتصادی اور صنعتی ترقی کا مظہر ہیں۔ اس شہر سے زبانِ اُردو کو بھی ایک گونہ تعلق رہا ہے۔ اور اس کا نام زبان پر آتے ہی وہاں کے اُردو شعراء و ادباء کے نام نامی ماضی کے دریچوں سے جھانکتے محسوس ہوتے ہیں۔ بدقسمتی سے اُردو زبان کی آسودہ حالی کا دور یہاں کے بدلتے ہوئے سیاسی موسم کی صحیح غمازی کرنے سے قاصر ہے۔ ہاں میر تقی میر کو جب اس زبان کے پرستاروں کے نئے مرکز پر پہنچ کر اپنا تعارف اِن الفاظ میں کرانا پڑا تو اُنہوں نے اُس دور کی بدحال معیشت کی دُرست ترجمانی فرمائی

میرؔ کے دین و مذہب کو اب پوچھتے کیا ہو اُن نے تو
قشقہ کھینچا، دیر میں بیٹھا، کب کا ترک اسلام کیا

یا پھر

دِلّی جو ایک شہر تھا عالَم میں اِنتخاب
رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
جس کو فلک نے لوٹ کے ویران کر دیا
ہم رہنے والے ہیں اسی اُجڑے دیار کے

لیکن آج دِلی پھر دِلی ہے۔ ایک عظیم الشان تاریخ و ثقافت کی رکھوالی اور دُنیا کے سب سے بڑے جمہوری مُلک ''انڈیا'' کی راج دھانی۔ لہٰذا اس سفر کی بات کرتے ہوئے ہم نہ تو غالب کے محلے بلی ماروں کا ذِکر کریں گے نہ بستی نظام الدین کا۔ مشہورِ زمانہ لال قلعہ، شاہی مسجد یا تُرک سلاطین کی یادگاروں اور قطب صاحب کی لاٹھ کو ہم نے ایک دفعہ پھر جا کر دیکھا۔ ان کا اجمالی ذکر ہم گزشتہ سفروں کی روداد میں بھی کر چُکے ہیں۔ اس دفعہ تو ہمارے مُطالعے کا خاص موضوع اس شہر کی مقامی حکومت اور پھر بھارت و پاکستان کے باہمی تعلقات کی اُونچ نیچ کی داستان سُننا تھا۔ سو ہم دہلی کی مقامی حکومت جو دراصل براہِ راست مرکزی حکومت کی تحویل میں چلتی ہے کے کارپردازوں سے ملے

اور پھر بھارتی سرکار کے بیرونی تعلقات کے سیکرٹری سے ہمکلام ہوئے۔اس موقع پر ہمارے ہمراہ پاکستانی سفارت خانے کے سب سے سینئر سفارت کار عزیز خان بھی موجود تھے۔لہٰذا ہم سفارت کاری کے اُس گُنجلک جال سے باہر نہ آسکے جو بدقسمتی سے دونوں پڑوسی مُلکوں میں پائے جانے والی باہمی بدگمانیوں کو کسی دور میں بھی دُور نہ کرسکا بلکہ بہت حد تک باہمی تعلقات کے اُتار چڑھاؤ میں وقتاً فوقتاً آنے والے مدوجزر کا مداوا کرنے میں بھی کامیابی حاصل نہ کرسکا۔بہرحال یہ بھی بڑی بات تھی کہ ہم ایک دوسرے کی بات صبر وتحمل سے سُن رہے تھے اور ہماری دونوں دیسوں کی مُسلح افواج ایک دوسرے کی سرحدوں پر خاموش بیٹھی سستا رہی تھیں۔

آگرے کی پہچان:

مُغل شہنشاہ شہاب الدین شاہجہاں کی مُحبتوں کا امین اور فنِ تعمیر کا بے مثل مُرقع تاج محل نہ صرف شہر آگرہ کی پہچان ہے بلکہ کئی حوالوں سے یہ فنِ سنگ تراشی اور عمارت سازی کی دُنیا میں سارے ہندوستان کی پہچان قرار دیا جا سکتا ہے۔ہم لوگ دریائے جمنا کے کنارے ایستادہ اس نادر روزگار عجوبہ کو دیکھنے گئے تو ہم میں سے اکثر کو اپنی آنکھوں پر ہی یقین نہ آئے۔آخر ایک زمانے تک اِسے دُنیا کے سات بڑے عجائبات میں شمار کیا جاتا رہا۔ہمارے ساتھی یوسف کمال نے تو ہر زاویہ سے تصویر کشی فرمائی۔تاج محل کی تعمیر میں استعمال کردہ پتھر ہی باکمال ہے اور اسکا استعمال کرنے والے کاریگروں کا تو انعام یہی ہوسکتا تھا کہ اُنکے ہاتھ کاٹ کر رکھ دیے جائیں تاکہ ایسی ہی کسی اور کوشش میں صانع حقیقی کی تخلیقات کو پیچھے نہ چھوڑ جائیں۔کہتے ہیں انگریزی دور میں برطانیہ سے ایک ولی عہدِ سلطنت یہاں آئے تو دُنیا ومافیہا سے گُزر کر ساری رات چاندنی رات میں تاج محل کے بدلتے رنگوں کی مسحور کُن فضا میں غرق ہوگئے۔

انگریز دوسری یورپی اقوام کے پہلو بہ پہلو ہندوستان کا مختصر ترین راستہ ڈھونڈنے میں صدیوں برسرِ پیکار رہا۔جب دیگر رقیبوں کو مات دے کر اس برصغیر کا بلا شرکتِ غیرے مالک قرار پایا تو اپنی تمام تر مقبوضات میں سے ہندوستان کو ہی ''تاجِ برطانیہ کا نایاب ہیرا'' قرار دیا۔یہیں سے تو وہ مُغل تاجداروں اور دیگر دعویداروں کے ہاتھوں سے چھین کر ''کوہِ نور'' ہیرا لے گیا جسے تاجِ برطانیہ میں چُن دیا گیا۔ہم نے بذاتِ خُود ٹاور آف لندن میں اس نایاب ہیرے کو مادر ملکہ کے تاریخی تاج میں جڑا ہوا اپنی آن بان سے چمکتا ہوا دیکھا۔

یہی ہی نہیں انگریز حُکمرانوں کو اپنی مقبوضات کی بے شمار اشیاء بھا گئیں۔حتیٰ کہ یہاں کے بُزرگانِ دین کی قبروں نے بھی اُنہیں اپنی طرف متوجہ کیا اور اُنہوں نے اُنکی قدر ومنزلت میں کوئی کسر باقی نہ

چھوڑی ۔ وائسرائے ہند لارڈ کرزن نے ایک دفعہ اپنے بادشاہ کی خدمت میں ایک مُراسلہ ارسال کیا تو اُسمیں یہ تاریخی جُملہ اجمیر کے بے تاج بادشاہ اور سُلطان الاولیاء حضرت مُعین الدین چشتی کے بارے میں لکھا۔ ''حضور ہندوستان پر تو گزشتہ آٹھ سو برس سے ایک قبر کی حُکمرانی ہے'' اور پھر دسمبر 1911ء میں ملکہ میری بنفسِ نفیس اجمیر شریف تشریف لے گئیں اور اپنی جیبِ خاص سے وضو کے لئے بنے ہوئے حوض کے اوپر ایک خوبصورت بارہ دری تعمیر کرنیکا حُکم صادر کر گئیں۔ [1]

شاہجہاں اور اُسکی ملکہ کو اُن گدی نشین بزرگوں کا ہم پایہ ہونیکی سعادت تو حاصل نہیں تھی لیکن ایک حدیث نبویؐ کے مطابق ''نیک اور مُنصف سلطان کی طاقت ستر وَلیوں کے برابر ہے'' کے مصداق سترہویں صدی کے اس سُلطان کے مرقد پر جانے کے لئے ادب آداب کے جُملہ تقاضے پورے کرنے پڑے۔ شاید اسی لیے ان کی قبروں پر حاضری دینے سے پہلے ایک کوتاہ قامت مرمریں دروازے میں سے سر جھُکا کر گُزرنا پڑتا ہے۔

عبرت نِشان یا نِشانِ منزل:

دورِ اکبری کے ایک تجربے کا ذکر ہم اپنے گزشتہ دورۂ ہند کے بیان میں فتح پور سیکری کے عنوان سے کر چکے ہیں۔ اس بار وہاں جانا ہوا تو واپسی پر سکندر آباد میں واقع مُغلِ اعظم جلال الدین اکبر کی آخری آرامگاہ پر بھی نظر ڈالی اور آنکھوں کے سامنے مغلیہ دور کے عہدِ شباب کا زمانہ گھوم گیا۔ اپنے والد نصیر الدین ہمایوں کے سایۂ عاطفت سے محروم اکبر باقاعدہ تعلیم و تربیت سے بھی نا آشنا رہا۔ ہمایوں بادشاہ اپنے جرنیل شیر شاہ سوری کے ہاتھوں ہزیمت اُٹھانے کے بعد برس ہا برس تک ایرانی دربار میں شاہی مہمان رہا۔ واپسی پر ماہر کاریگروں کی ایک فوج ظفر موج ساتھ لیتا آیا۔ جنہوں نے مُغل دربار کو علمِ و ثقافت کا بے مثل مرکز بنا دیا۔ ہمایوں کی اپنی موت اپنی ضخیم کِتابوں کی لائبریری کی سیڑھیوں سے اُترتے ہوئے پھسل جانے سے واقع ہوئی لیکن نوجوان اکبر اپنے چچا کے ہاں تھرپارکر کے ریگستان میں اپنے والد کی واپسی کے انتظار میں ماہ و سال شمار کرتا رہا۔ اسکندر آباد میں سنگِ سُرخ کے بنے ہوئے مقبرے میں بھی مقبرہِ ہمایوں کا عکس جھلکتا ہے۔ اکبر کا دور کئی لحاظ سے مُنفرد ثابت ہوا۔ اُسکی کتابوں سے دوری اُسکی موروثی حِسِ حُکمرانی کو متاثر نہ کر سکی۔ وہ کم عُمری ہی میں دُنیا کے ایک عظیم فاتح ظہیر الدین بابر کے اُس تخت پر جلوہ افروز ہوا جو اس سے پہلے اُس کے والد کھو چُکے تھے۔ اُسکا اندازِ حُکمرانی اپنی مثال آپ تھا جب اُسکی ساری رعایا ہندو۔ مُسلم۔ سکھ اور

[1] ''اللہ کے ولی'' ۔ مصنفہ خان آصف۔

دوسرے سب ہی بقولِ شخصے ایک گھاٹ سے پانی پیتے تھے۔ وہ سب کی سُنتا تھا۔ مذہبی مباحث بڑے شوق سے مُنعقد کراتا تھا۔ اپنے نورتنوں کے مشوروں سے ایک نیا دینِ الٰہی جاری کیا۔ آخر یہ نورتن بھی بھان مَتی کا کُنبہ تھا۔ گھنٹوں دریائے جمنا کے کنارے واقع اپنے جہازوں کے کارخانے میں کاریگروں کو کام پر دیکھ کر خوش ہوتا تھا۔

دہلی میں واقع اُسکے والد ہمایوں کا مقبرہ اپنی پائداری اور مضبوطی کے باعث صدیوں سے اب بھی ایک آب وتاب کے ساتھ موجود ہے لیکن یہ مقبرہ اُسکی موت کی دوصدیاں گزرنے کے بعد واقع ہونے والے دلخراش واقعات کا امین بھی ہے۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں سے آخری مُغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کو اپنی ملکہ اور شہزادوں سمیت سات سمندر پار سے آنیوالے نئے حکمرانوں کے حُکم سے گرفتار کر کے ہندوستان سے جلاوطن کر دیا گیا تھا اور رنگون (برما۔ حال میانمار) میں غریب الوطنی میں اپنی زندگی کے آخری ایام بسر کرنے پر مجبور کر دیا گیا تھا۔ شاید اب مُغلیہ سلطنت اپنے ضعیف العُمر بادشاہ کی طرح مکمل طور پر عُضوِ مُعطل بن چُکی تھی۔ اسی عالیشان مقبرے میں اُس واقعے کا تصور کر کے ہی ہندوستان کے آخری مُغل شہنشاہ کے ان اشعار کی صحیح تشریح سمجھ میں آتی ہے۔

شاہوں کے مقبروں سے دور دفن کیجیو
ہم بے کسوں کو گورِ غریباں پسند ہے

اور

ہے کتنا بد نصیب ظفر، دفن کے لیے
دو گز زمین بھی نہ مِلی کوئے یار میں

اس بار پھر ہم جنوبی بھارت کے شہروں ممبئی۔ بینگلور اور میسور گئے۔ اتفاق سے رمضان کا مُبارک مہینہ تھا۔ دن کا اُجالا چھٹنے لگا تھا اور ہم بینگلور شہر کی ایک بڑی سڑک پر سے گزر رہے تھے۔ مغرب کی اذان سُنائی دی تو ہم نے ڈرائیور کو کسی مسجد کے قریب ٹھہرنے کو کہا۔ یہ ایک خاصی بڑی مسجد تھی اور نمازی حضرات ٹولیوں کی صورت میں دائرے بنا کر اپنی اپنی صفوں پر افطاری کی لوازمات کے ساتھ بیٹھے مصروفِ دُعا نظر آئے۔ ہم بھی جلدی سے وضو کر کے نمازیوں کی صفوں میں شامل ہو گئے۔ نماز ختم ہوئی تو مسجد کچھا کھچ بھر چُکی تھی۔ ہمیں دہلی میں بھارتی سیکرٹری خارجہ جو خود بھی جنوبی ہند سے تعلق رکھتے تھے کے وہ الفاظ یاد آئے کہ ''بھارت میں مسلمانوں کی عددی اکثریت اب آپ کو شمالی ہند میں نہیں بلکہ جنوبی ریاستوں میں نظر آئیگی''۔ اُن دنوں کی اخباری اطلاعات کے مطابق ان علاقوں میں دائرہ اسلام میں نئے داخل ہونے والوں کی شرح میں خاصی افزودگی کی خبریں آرہی تھیں۔ جس سے کچھ حلقوں میں تشویش کے آثار نمایاں دکھائی دے رہے تھے۔ کسی شاعر نے اسی طرح کی صورتِ حال کو بھانپ کر کہہ رکھا ہے۔

جہاں میں اہل ایمان صورتِ خورشید جیتے ہیں
اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے، اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے